جدید غزل میں شہری مسائل کی عکاسی

کلیدی الفاظ: مسائل #عالمی جنگ #ثقافتی #مشکوک# کیفیت #صدی

عرفان علی بشر

رِسرچ اسکالر، شعبہ اردو

دہلی یونیورسٹی، دہلی۔۱۱۰۰۰۷

موبائل نمبر: ۹۷۹۲۵۱۲۱۴۸

ملخص: بیسویں صدی کی قیامت خیز ہنگاموں کے باعث انسان جن مسائل سے دوچار ہوا ان میں ایک شہری زندگی کے مسائل بھی ہیں۔ دراصل جب نئے سہر وجود میں آئے تو آرام و آسائش کے لئے گاؤں سے ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا۔ جدید معنی نظام اور بڑے شہروں کی میکانکی زندگی نے مشترکہ کلچر، انسانی رشتوں اور خلاقی ذمہ داری کا خاتمہ کر دیا۔ نوع انسان کے پاس اس سے سامنا کرنے کا کوئی بھی ایسا نظریہ یا تصور نہیں جس کے سہارے بھنور میں ڈوبی کشتی کو باہر نکال سکے۔ اس لئے اس کی شخصیت ٹوٹ کر بکھر گئی اور شہر کی زندگی میں وہ تنہاں ہو کر رہ گیا ہے۔ اس سے انتشار، افراتفری، مایوسی اور اداسی وغیرہ مسائل نے جنم لیا جس نے جدید دور کے حساس اور باشعور وفرد کو نفسیاتی و ذاتی الجھنوں کا شکار بنا دیا ہے بلکہ زندگی بے معنویت، شاعر کی انفرادیت، پوشیدہ خواہشوں، اس کی مجروح تمناؤں، نفسیاتی الجھنوں، خوابوں کی شکستگی اور محرومیوں کی دبیز چادر نے اسے لپیٹ لیا ہے۔ شہری زندگی سے پیدا شدہ ان تمام مسائل کو ہندو پاک کے جدید غزل گو شعراء نے اپنے شعری تجربے میں ڈھال کر اس کو ایک ناسٹلجیا کے طور پر پیش کیا ہے۔

بیسویں صدی کی دو عالمی جنگوں سے انسانی زندگی میں بے شمار تبدیلیاں رونماں ہویں۔ان تبدیلیوں کو اگر تغیّر وتبدّل کی صدی کہا جائے تو یہ غلط نہ ہوگا۔اس دور میں تقسیم ہند، صنعتی انقلاب کی نِت نئی ایجادات اورٹیکنالوجی کی قیامت خیز ہنگاموں کے باعث دنیا نے تیزی سے جو کروٹیں لیں اس سے سماجی، سیاسی، ادبی اور ثقافتی ہر لحاظ سے جہاں ایک طرف بہت سی خوشگوار تبدیلیاں ہوئیں اور انسان کو بہت کچھ ملا وہیں دوسری جانب زندگی کو خاک بسر کر کے اسے تمام تر تہذیب کے ساتھ مسخ کر دیا۔اس اِنتشار کی سب سے بڑی ضرب زندگی کی قدروں پر پڑی جس نے نوعِ انسانی سے نہ صرف اس کا ماضی چھین کر تمام اقدار بے معنی کر دیا بلکہ خدا کو بھی اس کی نظروں میں مشکوک کر دیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوگئی، اس کے راستے اتنے پیچیدہ، پرخطر اور ناہموار ہو گئے کہ وہ مادی وروحانی الجھنوں کے جنگلوں میں دنیا اورتمام رشتوں ناطوں سے مایوس ہوکر بھٹکنے لگا۔اسی کیفیت کہ وجہ سے آگے چل کر زندگی کا کرب، بے معنویت،، فرد کی مجروح تمنّا، نفسیاتی الجھنوں، خوابوں کی شکستگی اورمحرومی، تنہائی وداداری، افراتفری، اداسی، گھبراہٹ اورحساس مرگ جیسے احساسات نے اس دور کے انسان میں مرکزی جگہ لے لی۔

جدید دور میں ملک کی تقسیم، مشینی زندگی، نیچر سے انسان کی ازلی وابستگی کے خاتمے اور خدا کے تصوّر کے زوال نیز تمام پرانی اقدار کے مٹ جانے کے بعد جوشاعری خاص طور سے غزل وجود میں آئی اس میں احساس تنہائی، اداسی، بے چینی، زندگی کی بے مقصدیت، افراتفری اور ذہنی کشمکش

وغیرہ وہ مسائل ہیں جس میں جدید دور کا انسانی ذہن پوری طرح جکڑا ہوا ہے۔(یہ ذہنی رویہ اسی قت پیدا ہوتا ہے جب ہر طرح کے سماجی اور انسانی اقدارِ عمل سے اعتقاد اٹھ جائے) یہ مسائل زیادہ تر شہری زندگی کی دین یا یوں کہیں کہ اس کی ایک بڑی وجہ شہری زندگی کا المیہ ہے جس نے اس انسان کی زندگی کو اس کٹہرے میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ہند و پاک کے شعراء میں ناصؔر کاظمی، شہزاؔد احمد، باؔنی، بشیر بدر، عتیق اللہ، باؔنی سلیم احمد، کیفی اعظمی، احمد مشتاؔق احمد فراؔز، منیر نیازؔی، مجید احمد، قتیل شفائی، محمد علوؔی، ساقؔی فاروقی وغیرہ وہ شاعر ہیں جنہوں نے (گاؤں کی معصومیت اور پر سکون فضا) شہری زندگی کے مسائل کو شعری تجربے میں ڈھال کر اس کو ایک ناسٹلجیا (Nostalgia) کے طور پر پیش کیا ہے۔گرجا کمار ماتھر نے اپنے ایک مضمون میں کچھ الفاظ کی تشریحات پیش کی ہیں جو اس دور کے شہری زندگی کی بخوبی آئینہ داری کرتی ہے:

’’**مذہب**۔ ماضی پرستی کا نام ہے۔

خاندان ۔اِنتشار کا شکار ہے کیونکہ فرد اور خاندان کے رشتے ٹوٹ چکے ہیں۔انفرادی

اور مخصوص اور غیر انفرادی اور عمومی میں کوئی فرق نہیں رہ گیا۔

ازواجی رشتہ۔دو طلاقوں کے درمیان کی فرصت

پیار۔ برتھ کنٹرول اور استفاطِ حمل اور بوریت کا لمحاتی اظہار۔

خدا۔ایک تخیل جس کے وجود کا کوئی امکان نہیں۔

سماجی بہبودی۔امیر لوگوں اور عورتوں کا مشغلہ۔

سیاست۔گروہ بندیوں کی دوڑ اور جھوٹے منشور۔"[1]

دراصل جدید دور کے تغیرات سے تصوراتی سطح پر جہاں حیات و معاشرے کے ہر شعبے کا رومانی طلسم ٹوٹا وہیں۔ دیہاتی زندگی کا طلسم بھی ٹوٹ کر بکھر گیا۔ بہت سے نئے شہر وجود میں آ گئے۔ اچھی تعلیم، روزگار، علاج اور آرام و آسائش کے لئے گاؤں سے ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا۔کل تک جو لوگ گاؤں دیہات کی کھلی فضا میں سانس لیتے تھے،ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک ہوتے تھے اس کے برعکس شہر میں اجتماعی نظام زندگی کا تصوّر ختم ہو گیا۔شہر میں آ کر ان کی زندگی مشینی زندگی میں تبدیل ہو گئی جس سے فرد کی اپنی شناخت اس میں گم ہو کر رہ گئی۔ اگرچہ شہر کی رونقیں بظاہر خارجی زندگی کو روشن کرتی نظر آئیں مگر روح کو تسکین فراہم نہیں کر سکیں۔

سماجی اور انسانی اقدار کے اس زوال نے رشتوں کے تقدس کو پامال کر دیا۔کسی انسان کا کسی سے کوئی دلی رشتہ قایم نہیں رہ گیا ہے۔ایک تعلق بس، تجارتی کاروباری بن کر رہ گیا ہے۔ اخلاق، محبت، اخوت، ہمدردی اور شرافت جیسے الفاظ کے معنی ہی بدل گئے۔صارفیت اور مادیت کا بول بالا ،مال، دولت،عزت و شہرت زندگی کے معیار بن گئے۔ نیز تمام تعلقات کا مقصد ذاتی مفاد و غرض ہو گئے۔شعراء نے ان حالات میں جائے پناہ تلاش کرنے کی کوشش کی جہاں اسے ذہنی سکون مل سکے جو اسے میسر نہیں۔شہری زندگی کے حوالے سے سیّد محمد عقیل لکھتے ہیں:

''تمام خاندانی رشتے، انسانی رشتے، اور سلسلے سب ختم ہو جاتے ہیں، محبت کہیں صرف فرض نبھانے کا نام ہے اور کہیں اپنے کام نکالنے کا زینہ جو کام کے ختم ہوتے ہی اپنی افادیت، ضرورت، اور حیثیت ختم کر دیتا ہے۔ تمام دنیا کی تگ و دو، انسانوں کو ارتقاء کی طرف لے جاتی ہے۔ مگر ایک مشینی اور غرض مندی کی سی کشش ہے، اس میں کہیں وہ محبت اخوت، اور اطمینان جو جاگیردارانہ ٹھہرے ہوئے سماج میں بڑی چمک دمک اور استواری کے ساتھ ملتے تھے۔ ان سب کا قریب قریب خاتمہ ہو چکا ہے، وعدے، وعید، عہد و پیماں سب پرانی قدریں ہیں، اس لئے اس میں لمحاتی مفاہمت ہی کافی ہے۔''۲

کل تک گاؤں میں جن تصوّر سے زندگی کی رونقیں اور حشاش و بشاش نظر آتے تھے وہ اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ شہر میں آکر انسان بالکل تنہاں ہو گیا ہے۔ یہاں اس کا کوئی بھی آشنا دوست نہیں ہے۔ اس کی حیثیت صرف ایک پیسہ کمانے والی مشین کی سی بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے دل و دماغ پر مشین کی حکمرانی قائم ہوگئی۔ گاوں جسے وہ چھوڑ کر شہر آ گیا۔ یہاں اس کے پاس گھر بھی نہیں رہا کیونکہ ایک یا دو کمرے اور چھت کو گھر نہیں کہہ سکتے۔ گھر وہ ہے جہاں بہت سی خوبصورت یادیں جڑی ہوئی ہوں، درد و غم کو ہلکا کرنے کے لئے بہت سے عزیز محسن و غم خوار موجود ہوں۔ ان میں اخوت محبت اور غم گساری کی خوشبو آتی ہو۔ شہر میں تنگ

گھروں خالی چھتوں سے تنہائی اور بیزاری کی کیفیت پیدا ہو جانا لازمی ہے۔جدید غزل میں ان کھوئی ہوئی حسین یادوں کی کسک اور حساس کا ذکر کچھ یوں ملتا ہے:

کبھی کبھی تو یوں کہ ہم سب مشینیں ہیں
تمام شہر میں نہ کوئی زن ہے نہ ناری ہے
(بشیر بدر)

گاؤں کے پرندے تم کو کیا پتا بدیسوں میں
رات ہم اکیلوں کی کس طرح گزرتی ہے
(عتیق اللہ)

وہ کوئی دوست تھا اچھے دنوں کا
جو پچھلی رات سے یاد آ رہا ہے
(ناصر کاظمی)

ڈھلے گی شام جہاں کچھ نظر نہ آئے گا
پھر اس کے بعد یاد بہت گھر کی آئے گی
(بانی)

در بدر ٹھوکریں کھائیں تو یہ معلوم ہوا
گھر کسے کہتے ہیں کیا چیز ہے بے گھر ہونا
(سلیم احمد)

اگر چہ شہری زندگی کی ظاہری چکا چوند نے لوگوں کو دیہات اور گاؤں سے ہجرت کرنے کی طرف مائل کیا ہے۔مگر وہ ذہنی اور جذباتی طور

سے کہیں نہ کہیں اپنی زمین سے جڑا ہوا ہے یہی وجہ ہے جب شہری زندگی کی بے حسی اور تنہائی انہیں پریشان کرتی ہے تو فوراً انہیں بیتے دنوں، چھوڑی ہوئی جگہوں اور اپنے چاہنے والوں کی یاد ستانے لگتی ہے۔ گاوں کی معصومیت بھری زندگی، اپنائیت اور خلوص کو یاد کر کے اپنی احساس تنہائی کو مزید اذیت ناک بنا لیتے ہیں ہے:

کہاں گئے وہ نگر کشادہ
کھلی چھتیں اور گھر کشادہ
(باؔنی)

وہ جنگلوں میں درختوں پر کودتے پھرنا
بہت برا تھا مگر آج سے تو بہتر تھا
(محمد علویؔ)

میرا بچپن بھی ساتھ لے آیا
گاؤں سے جب بھی آ گیا کوئی
(کیفی اعظمی)

ایک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اور اب کوئی کہیں کوئی کہیں رہتا ہے
(احمد مشتاقؔ)

ایک طرف رشتوں، انسانیت کے بدلتے پس منظر نے تو دوسری طرف شہری زندگی اور بڑھتی ہوئی آرزوں خواہشوں نے احساس تنہائی، مایوسی اور بے بضاعتی جیسے احساسات کو دو چند کر دیا ہے۔ اس لئے ایک

طرف باہر کی زندگی، دوڑ بھاگ شور شرابے کہ اپنی صدا بھی سنائی نہیں دی، دوسری طرف گھر کی خاموشی جہاں وہ اپنے مستقبل اور فکر تلاش معاش میں گم ہوتا ہے۔ جدید انسان کے پاس کوئی بھی ایسا سہارا نہیں جس کے ذریعے وہ اپنی تنہائی اداسی کو ختم کر سکے کیونکہ یہ اپنی زمین سے کٹ چکا ہے۔ خاندانی رشتے جو سکون کا باعث ہوا کرتے تھے ٹوٹ چکے ہیں۔ جدید انسان ہر روز ایک امنگ اور امید لے کر اٹھتا ہوا شام کو ناکام واپس لوٹتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہری زندگی کے شور شرابے، ہنگامے اس کی تنہائی کو ختم نہیں کر پاتے بلکہ مزید بے چینی، گھبراہٹ اور الجھن کا سبب بنتے ہیں۔ حامد کاشمیری اپنی کتاب 'نئی حسیت اور عصری اردو شاعری' میں شہری کشمکش کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شہروں میں ایک جدید مخلوط قسم کی نا قابل شناخت معاشرت تشکیل پا رہی ہے، جو رنگ نسل اور علاقائیت کے امتیازات کو بنیادی اہمیت دینے کے تصوّر سے نا آشنا ہے۔ کارخانوں، سرکاری، غیر سرکاری اداروں اور تجارتی کمپنیوں کی توسیع سے لوگوں کو مصروفیت اور کثرت کار کا سامنا ہے۔ لوگ محلے کے روابط، رشتے ناطے اور آپسی مراسم سے دور ہو کر صرف اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنے کی فکر میں سرگرداں ہیں نئی کالونیوں کی تعمیر سے باہمی رشتے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں انسان دیو پیکر اداروں بلند بالا عمارتوں، وسیع وعریض سڑکوں عظیم فولادی صنعتوں کے سامنے اپنے آپ کو بے مایہ

محسوس کرنے لگا ہے۔ مادیت بلا واسطہ رابطوں اور خودغرضیو
ں کے بڑھتے ہوئے رجحان نے اسے بے زاری، بے چہرگی
اور بے بسی میں گرفتار کیا ہے۔'' ۳۴

اس طرح جدید معنی نظام اور بڑے شہروں کی میکانکی زندگی نے مشترکہ کلچر اور خلاقی ذمہ داری کا خاتمہ کر دیا۔ نوع انسان کے پاس اس سے سامنا کرنے کا کوئی بھی ایسا نظریہ یا تصور نہیں جس کے سہارے بھنور میں ڈوبی کشتی کو باہر نکال سکے۔ اس لئے اس کی شخصیت ٹوٹ کر بکھر گئی اور شہر کی زندگی میں وہ تنہاں ہوکر رہ گیا ہے۔ انتشار، افراتفری اور مایوسی اور اداسی وغیرہ کی اس کیفیت نے جدید دور کے حساس اور باشعور فرد کو نفسیاتی و ذاتی الجھنوں کا شکار بنا دیا ہے۔ بلکہ زندگی بے معنویت، شاعر کی انفرادیت، پوشیدہ خواہشوں، اس کی مجروح تمناؤں، نفسیاتی الجھنوں، خوابوں کی شکستگی اور محرومیوں کی دبیز چادر نے اسے لپیٹ لیا ہے۔

جدید غزل میں شہری زندگی جو جدید شاعر کو ایک آسیب دزدہ معلوم ہوتی ہے وہ اس ہولناک مناظر اور اس سے پیدا ہونے والی گھٹن سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے مگر پھر بھی اسے اس سے نجات ممکن نہیں ہے۔ گاوں کی زندگی پر سکون اور اطمینان بخش تھی کسی چیز سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا مگر شہر کی زندگی بالکل مختلف ہے۔ یہاں دن بھر کام میں مصروف اور شب آتے ہی خیالات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جو اس کی آنکھوں سے نیند غائب کر کے ایک ڈر خوف کا سماں پیدا کر دیتا ہے۔ اسے اپنے اندر ایک دوسری شخصیت کے ابھرنے کا احساس ہوتا ہے جو اس کے جسم

کے اردگرد چیخ رہا ہے مگر غور کرنے پر اسے اپنا ہی عکس نظر آتا ہے۔نئی زندگی میں انسان اپنی ضروریات، خواہشات کے نیچے دب کر رہ گیا ہے۔

اس سے خوف وشک کا سلسلہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ وہ اپنے آپ اور اپنے سایہ سے بھی خوف زدہ ہو جاتا ہے۔اور انجانی چیزوں کا خوف اور جانی فطرت سے اس کے تمام رشتے ختم کر دئے ہیں۔جس کی وجہ سے وہ بے سکونی جھنجھلاہٹ کا شکار ہو چکا ہے، بسا اوقات تو وہ اپنے جسم کی قید کو بھی گراں سمجھتا ہے اور اس سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔یہی وجہ ہے جدید غزل میں ردعمل کے طور پر موت اور فنا کا احساس کثرت سے ملتا ہے۔اگر چہ یہ اتنا آسان نہیں اس لئے چیخ و پکار اس کی ضرورت بن چکی ہے۔ان چند اشعار سے شہری زندگی سے پیدا شدہ الجھنوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

ہزار چہرے ہیں موجود مگر آدمی غائب
یہ کس خرابے میں دنیا نے لاکر چھوڑ دیا
(شہزاد احمد)

پھیلا ہوا تھا شہر میں تنہائیوں کا جال
ہر شخص اپنے اپنے تعاقب میں غرق تھا
(سلطان اختر)

سڑک پر چلتے پھرتے دوڑتے لوگوں سے گھبرا کر
کسی چھت پہ مزے سے بیٹھے بندر دیکھ لیتا ہوں
(محمد علوی)

اکیلے پن کی اذیت سے اب گلہ کیسے
فراز خود ہی تو اوروں سے ہوگئے تھے الگ
(احمد فرازؔ)

اجنبی شہروں میں رہتے عمر کٹ گئی
گو زرا فاصلے پر گھر کی ہر راحت تھی
(منیر نیازی)

ہے عجیب شہر کی زندگی نہ سفر رہا نہ قیام
کہیں کاروبارسی دوپہر کہین بدمزاج سی شام
(بشیر بدر)

یہ کیا طلسم ہے، کیوں رات بھر سسکتا ہوں
کون ہے جو دیوں میں جلا رہا ہے
(ساقیؔ فاروقی)

دن کٹ رہے ہیں کشمکشِ روزگار میں
دم گھٹ رہا ہے سایۂ ابر بہار میں
(مجیدؔ امجد)

ہمیں بھی نیند آجائیگی ہم بھی سو ہی جائیں گے
ابھی کچھ بےقراری ہے ستاروں تم سو جاؤ
(قتیلؔ شفائی)

بگڑی ہوئی اس شہر کی حالت بھی بہت ہے
جاؤں بھی کہاں اس سے محبت بھی بہت ہے
(شہزادؔ احمد)

مکاں ہے قبر جسے لوگ خود بناتے ہیں
میں اپنے گھر میں ہوں یا میں کسی مزار میں ہوں
(منیؔر نیازی)

مذکورہ تمام اشعار میں جس شہر نے انسان سے اس کی ماضی کا سرمایہ چھین لیا۔شب روز کی مسلسل دوڑ دھوپ نے اس کے خط وخال سے جوانی کا رس نچوڑ لیا۔شہر کی تپتی ڈھوپ جس نے گاؤ کی گھنیری شام کے فسوں سائے چھین لئے شہروں کی بڑھتی آبادی جس نے سہنِ چمن خاک میں ملا دیا۔ چمکتے دمکتے ملبوسات جنھوں نے اس کی روح کو عریاں کر دیا۔ چیختی دہاڑتی مشیلون اور ملوں کی آوزیں جن میں بانسری کی سریلی مدھ بھری آوازیں ڈوب گئیں، مصلحت اندیش دوست جنھوں نے دوستی اور خلوص کا خون اور تفریح وطبع کے وہ تمام اسباب جس نے اس سے جسمانی امراض میں مبتلا کر دیا اور اس طرح کے دوسرے تمام مسائل جس سے شہر کی زندگی دوچار ہے اس کی داخلی نفسیاتی کشمش کا اندازہ ہوتا ہے۔

حواشی:

۱۔ ادب اور جدید ذہن،دیویندر اِسّر، مکتبہ شاہ راہ، اردو بازار، دہلی، ۱۹۶۸ء ص ۲۷

۲۔ سیّد محمد عقیل ، غزل کے نئے جہات، اے ون آفسیٹ ، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۲۴

۳۔ ڈاکٹر حامد کاشمیری، نئی حسیت اور عصری اردو شاعری، جمّوں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگوئجز۔سرینگر، ۱۹۷۴ء ص ۹۷

☆☆☆